ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

خُودی کا انقلاب (۵)

ارتقائی حرکت کا ہمہ گیر قانون

عقلی طور پر حقیقت قدرت کے جس قانون کی مظہر ہے کائنات کی ساری ارتقائی حرکت اُسی پر مبنی ہے۔ جب زندگی کی کوئی مخفی قوت ارتقاء کے کسی مرحلہ پر ایک حد تک آشکار ہو جاتی ہے تو پھر زندگی ارتقاء کے مقاصد کی پیش بُرد کے لیے اس حد تک اپنی کسی مخفی قوت پر نہیں بلکہ اپنی آشکار قوت پر انحصار کرتی ہے، اسی کو اپنا آلۂ کار بناتی ہے اور اسی کے ذریعہ سے ارتقاء کے عمل کو آگے بڑھاتی ہے۔ گویا زندگی 'کُن' کے عمل کو جاری رکھنے اور منزلِ مقصود تک پہنچانے کے لیے ہر قدم پر 'کُن' کے حاصلات ہی سے کام لیتی ہے اور اُس کے موجودہ حاصلات آئندہ کے حاصلات کا ذریعہ بنتے ہیں۔ مثلاً زندگی نے مادی مرحلۂ ارتقاء کے اندر مادہ کی ابتدائی حالت کی شکل میں برقی قوت کے مثبت اور منفی باروں (CHARGES) کو آشکار کیا۔ مادہ کی ابتدائی حالت ان ہی باروں سے عبارت تھی پھر ان باروں کے عمل کے ذریعہ سے زندگی نے مادہ کو مزید ترقی دینے کا مقصد حاصل کیا، جس سے مادہ کو نئی قوتیں حاصل ہوئیں۔ پھر ان نئی قوتوں کو مادہ کی مزید ترقی کا ذریعہ بنایا اور یہ عمل جاری رہا، یہاں تک کہ مادہ کی وہ تمام خصوصیتیں جن کو آج ہم مادی قوانینِ قدرت کہتے ہیں ظہور پذیر ہو گئیں۔ اسی طرح سے جب پہلا حیوان وجود میں آیا تو وہ فقط ایک ہی خلیہ پر مشتمل تھا۔ اس خلیہ میں زندگی نے نقل و حرکت کی استعداد کے علاوہ اخذِ غذا اور توالد کی دو جبلتیں بھی پیدا کیں جو ابتدائی حالت میں تھیں۔ زندگی نے ان دو جبلتوں کے فطری عمل کو حیوان کی مزید ترقی کا ذریعہ بنایا، جس کے نتیجہ کے طور پر بہتر سے بہتر قسم کی انواعِ حیوانات وجود میں آتی رہیں، یہاں تک کہ حضرتِ انسان نمودار ہوا۔ انسان کی تمام فطری قوتوں میں سب سے زیادہ اہم اور مرکزی اور بنیادی قوت خدا کی محبت یا آرزوئے حسن ہے۔ اس

© rasailojaraid

قوت کے عمل کے ذریعہ سے زندگی انسان کو ہزاروں سال سے متواتر ارتقاء کے مدارج طے کروا رہی ہے جس کی وجہ سے انسان کو ہر مرحلہ پر نئی نئی قوتیں حاصل ہو رہی ہیں۔ علوم کا سارا ذخیرہ اور زندگی کے مشاغل کی تحسین، تزئین اور تسہیل کے سارے ذرائع اور طریقے جو انسان اب تک پیدا کر سکا ہے، اسی قوت کے بعض پہلوؤں کے عمل کا نتیجہ ہیں۔ تاہم ابھی تک نسل انسانی نے مجموعی طور پر اس قوت سے صحیح طور پر کام لینا نہیں سیکھا۔ جب انسان اپنی آرزوئے حسن کو صحیح تصورِ حسن کی محبت سے مطمئن کرتا ہے تو اس کی شخصیت اس قوت کے ساتھ ایک ہو جاتی ہے جو کائنات کے تخلیقی اور ارتقائی عمل کو حرکت دے رہی ہے اور یہ خدا کے قولِ کُن کی قوت ہے۔ لہٰذا جس حد تک کہ مومن کی شخصیت اس قوت کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتی ہے، اس حد تک مومن کا اپنا قولِ کُن بھی کائنات کے ارتقائی عمل پر اسی طرح سے اثر انداز ہوتا ہے جس طرح سے کہ خدا کا قولِ کُن اثر انداز ہو رہا ہے کیونکہ اس حد تک خدا کا قولِ کُن مومن کے قولِ کُن کی صورت اختیار کرتا ہے۔ خدا انسان کے اندر کائنات کے ارتقاء کے آخری مرحلہ میں قولِ کُن کی قوت کو آشکار کرتا ہے۔ لہٰذا اگر وہ کائنات میں اپنے آخری تخلیقی اور ارتقائی مقاصد کے حصول کے لیے اپنی اس آشکار قوت سے کام لے جس سے انسان اس کی مرضی اور اس کی تقدیر کا آلۂ کار بن جائے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں، کیونکہ یہ خدا کے سابق دستور اور طریقِ عمل کے عین مطابق ہے۔ جب مردِ مومن خدا کا ہاتھ یا پاؤں یا کان یا آنکھ بن جاتے تو تعجب کیا ہے کہ خدا اس کے ان اعضاء سے پکڑنے، ریت پھینکنے، چلنے، سننے یا دیکھنے کا کام لے۔ خدا بننے یا خدائی کا راز دان بننے سے اقبال کا مطلب بس اتنا ہی ہے اور اس میں غلط فہمی کی گنجائش نہیں۔ اقبال کے جو نکتہ چین غلطی سے سمجھتے ہیں کہ اقبال خودی اور خدا میں فرق نہیں کرتا وہ اس گزارش کو نوٹ فرمائیں۔

یک رنگی اور بیباکی

خودی کے انقلاب کے بعد مومن یک رنگ، یک دل اور یک زبان ہو جاتا ہے۔ اسے مکاری، منافقت اور ڈپلومیسی کی ضرورت نہیں رہتی۔ چونکہ مومن کے دل میں خدا کی نہایت ہی گہری اور شدید محبت پیدا ہو جاتی ہے، اس کے خیالات ایک مرکز پر جمع ہو جاتے ہیں اور وہ مرکز خدا کی ذات ہوتا

ہے۔ پھر وہ مخالف افکار و آراء اور متضاد اعمال و افعال کا شکار نہیں رہتا۔ خودی کی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے خیالات اور اعمال کو خدا کے مرکز پر جمع کرے۔ لہٰذا جب اس کے خیالات اور اعمال اس ایک مرکز پر جمع ہو جاتے ہیں تو وہ اپنی فطرت کو پالیتی ہے اور اس کی زندگی کی قوت بھی ایک مرکز پر آ جانے کی وجہ سے ممکن حد تک بڑھ جاتی ہے۔

حیات کیا ہے، خیال و نظر کی مجذوبی! خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گوناگوں!

مومن کی شخصیت میں ایک مکمل وحدت اور ہم رنگی کے ساتھ ہی ایک مکمل خود اعتمادی کی کیفیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسے اپنے طے کیے ہوئے اعتقاد و عمل کی صحت پر اتنا بھروسہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے موقف کو کسی خوف سے بدلنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا۔ اگر زمانہ اس کے ساتھ موافقت نہ کرے تو وہ زمانہ سے موافقت نہیں کرتا بلکہ زمانہ کو بدل کر اپنے ساتھ موافق کرنے کے لیے جد و جہد کرتا ہے۔

حدیثِ بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز
زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز!

لہٰذا اسے جھوٹ یا فریب یا روباہی سے، جسے اقبال حیلۂ افرنگی کہتا ہے، کام لینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ صاف صاف بات کہتا ہے خواہ نتائج کچھ ہوں۔

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی!

محبت کے اندر یکسوئی اور بیباکی اس کی محبت کو درجۂ کمال پر قائم رکھتی ہے۔ اخلاص کے بغیر محبت کی کامیابی ممکن نہیں ہوتی، لیکن اخلاص کو قائم رکھنا ذرا ہمت کا کام ہے۔

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہرِ یکدانہ!
یک رنگی و آزادی اے ہمتِ مردانہ!

زندگیٔ جاوید

خودی کے انقلاب کے بعد مومن زندۂ جاوید ہو جاتا ہے اور موت اس پر حرام ہو جاتی ہے۔

یہ حقیقت کہ ہماری خودی ہمہ تن خدا کی محبت ہے جو حیّ و قیوم ہے اور خود بخود زندگی اور حیات ہے،

© rasailojarai

اس بات کی دلیل ہے کہ اگر ہم خدا کی محبت کی نشوونما کر کے درجۂ کمال پر پہنچا دیں تو ہم خود بھی خدا کی طرح جاوداں بن سکتے ہیں۔ کیونکہ ضروری ہے کہ خدا کا کامیاب عشق بھی خدا کی صفات کو جذب کر کے جن میں ایک ہمیشہ کی زندگی ہے، ہمیشہ کے لیے زندہ ہو جائے۔ ہمارا اور خدا کا تعلق اگرچہ ایک راز سربستہ ہے لیکن ہمارے دوام کا گواہ ہے۔

من داد چیست اسرار الٰہی است ـــــ من داد بر دوام ما گواہی است

جب ہم زندگی پر عاشق ہیں اور ہمارے عشق میں پوری طرح سے کامیاب ہونے کی صلاحیت ہے تو صاف ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ ہم خود زندگی بن جائیں۔ ہمارا قدرتی مستقبل جو ہماری غیر مبدل فطرت میں پوشیدہ ہے، زندگی ہے موت نہیں، ورنہ ہم سراسر زندگی کا کامیاب عشق نہ بن سکتے۔ زندگی سانس کا یہ آنا جانا نہیں، بلکہ اس کا منبع خدا ہے جو حیّ و قیوم ہے اور جس کی محبت ہماری فطرت میں ہے۔

زندگانی نیست تکرارِ نفس
اصلِ اُو از حیّ و قیوم است و بس

ضروری ہے کہ زندگی کا عشق بھی ایک ایسی زندگی ہو جو زندگی کے اصل مرکز یا منبع سے کھو چکی ہو اور پھر اپنی اصل کی طرف لوٹنے کی خواہش رکھتی ہو۔ اور اسی خواہش کی وجہ سے وہ عشق بن گئی ہو۔ عشق کا اصل زندگی کی طرف لوٹنے کی تمنا کرنا ہی اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ زندگی کو پا سکے گا جس کے بعد موت اس پر حرام ہو جائے گی کیونکہ عشق حقیقی کی تمنا ناکام نہیں ہوتی۔

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اُس پر حرام

اے حرمِ قرطبہ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بُود

جسمِ حیوانی اور شخصیتِ انسانی کی مماثلت

ایک جسمِ حیوانی کی صحت کا دارومدار اس بات پر ہوتا ہے کہ اس کے اندر زندگی کی رَو کس قدر قوی ہے۔ اگر جسمِ حیوانی میں زندگی کی رَو قوی ہو تو وہ موت لانے والے عوامل یعنی بیماریوں اور جراثیمی

om

سرایتوں پر بآسانی غالب آجاتا ہے۔ بیمار، کمزور اور نحیف جسم حیوانی کے اندر زندگی کی رو کمزور ہوتی ہے اور وہ بیماریوں اور جراثیمی سرایتوں کو قبول کرنے کے لیے اور بھی مستعد ہوتا ہے۔ جسم حیوانی کی صحت اور زندگی کی رو کی قوت کا دار و مدار اس کی خوراک کی عمدگی پر اور صحت کو قائم رکھنے والے دوسرے حالات کی موجودگی پر اور نیز اس بات پر ہوتا ہے کہ اس کی جسمانی نشوونما اور پرورش کیسے ہوئی ہے۔

اسی طرح سے انسان کی روح یا خودی کی صحت کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ اس کے اندر زندگی کی رو جو خدا کی محبت کی صورت اختیار کرتی ہے کس قدر قوی ہے اور پھر اس رو کی قوت کا دار و مدار اس بات پر ہوتا ہے کہ اس کا تصورِ حسن جس سے اس کی خودی حسن کی غذا جذب کرتی ہے، عمدہ اور حسین ہے یا نہیں اور اس کی زندگی کے تجربات اور اعمال و افعال خدا کی محبت سے سرزد ہوتے ہیں یا نہیں، اور اس نے خدا کی محبت کی نشوونما اور پرورش کس حد تک کی ہے۔ اس زندگی میں بھی اگر روح یا خودی میں زندگی کی رو یا خدا کی محبت قوی ہو تو وہ روحانی موت لانے والے عوامل یعنی گناہوں، اخلاقی کمزوریوں اور بیماریوں پر غالب آجاتی ہے۔ خدا کی محبت سے دور اور اخلاقی کمزوریوں اور بیماریوں سے گھری ہوئی خودی خدا سے اور دور ہونے اور اخلاقی کمزوریوں اور بیماریوں میں اور غرق ہونے کے لیے مستعد ہوتی ہے۔ اگر ایک قوی اور توانا جسم کچھ عرصہ کے لیے خوراک اور حفظانِ صحت کے لوازمات کو ترک کر دے تو وہ کمزور اور ناتواں ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سے اگر ایک قوی اور توانا خودی جس میں زندگی یا خدا کی محبت کی رو طاقتور ہو، کچھ عرصہ کے لیے خدا کی مخلصانہ عبادت اور حسنِ عمل کو ترک کر دے تو وہ کمزور اور ناتواں ہو جاتی ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ جس طرح سے جسم کی صحت اور زندگی کی حالت کئی درجوں کی ہوتی ہے اسی طرح سے خودی کی صحت اور زندگی کی حالت بھی کئی درجوں کی ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خودی کا عشق بھی اپنی قوت اور شدت کے لحاظ سے کئی درجوں کا ہوتا ہے۔ جس قدر زیادہ کوئی انسان خدا کی محبت سے بہرہ ور ہوگا اسی قدر زیادہ وہ زندگی سے بہرہ ور ہوگا۔

زندگی کے مدارج اور حیاتِ مطلق

زبورِ عجم میں اقبال نے زندگی کے درجوں کے متعلق اپنے نقطۂ نظر کو ذرا وضاحت سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ زندگی اور موت اعتباری اوصاف ہیں جن کا دار و مدار حالات پر ہے۔ جہاں تک نوا

© rasailojaraid.

کے سوز اور اثر کا تعلق ہے ہم کہیں گے کہ ایک بہرہ مردہ ہے۔ اسی طرح سے ایک اندھا جو بہرحال نوا سے مست اور مسرور ہو جاتا ہے، رنگ کی طرف سے مردہ ہے۔ رُوحِ خدا سے زندہ اور پائندہ ہوتی ہے اور خدا سے ہٹ جائے تو خدا کی طرف سے مردہ اور غیر خدا کی طرف سے زندہ ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حیاتِ مطلق کیا ہے؟ اقبال کہتا ہے کہ حیاتِ مطلق یہ ہے کہ انسان خدا کے ساتھ زندہ رہے کیونکہ خدا وہ زندہ ہستی ہے جو خود بخود زندہ ہے اور مرتی نہیں۔ جو خدا کے بغیر زندہ ہے وہ موتِ مطلق سے مرا ہوا ہے، اگرچہ وہ بظاہر زندہ نظر آ رہا ہو اور لوگ اس کا ماتم نہ کر رہے ہوں۔

مردن و ہم زیستن اے نکتہ رس — ایں ہمہ از اعتبارات است و بس
مُردِ کر سوزِ نوا را مردۂ — لذّتِ صوت و صدا را مردۂ
پیش چنگے مست و مسرور است کور — پیش رنگے زندہ در گور است کور
رُوح باحق زندہ و پائندہ است — ورنہ ایں را مردہ، آں را زندہ است
آنکہ حیّ لایموت آمد حق است — زیستن باحق حیاتِ مطلق است
ہر کہ بے حق زیست جز مردار نیست — گرچہ کس در ماتمِ اُو زار نیست

کامل زندگی اس شخص کی قسمت میں ہوتی ہے جو خدا کی محبت کو عبادت اور حسنِ عمل سے ترقی دے کر کمال کے اس درجہ تک پہنچا دے جہاں وہ خدا کو دیکھ لے اور زمان اور مکان کی قیود سے آزاد ہو جائے۔ خدا کا دیدار زندگی ہے اور زندگی خدا کا دیدار ہے۔ قرآنِ حکیم میں ہے کہ خدا احسان والوں کو پسند کرتا ہے۔ (وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ) اور حدیث شریف میں ہے کہ احسان کا مقام یہ ہے کہ انسان خدا کی عبادت اس طرح سے کرے کہ گویا وہ خدا کو دیکھ رہا ہے (اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ)

یہی وہ مقام ہے جہاں انسان بندِ زمان و مکان سے آزاد ہو جاتا ہے۔ انبیاء جو خدا کی مخلصانہ عبادت کی دعوت دیتے ہیں وہ دراصل احسان یا دیدارِ حق کے مقام کو پانے کی دعوت دیتے ہیں لیکن اس دعوت کا نتیجہ احسان ہی نہیں بلکہ کمالِ زندگی بھی ہے۔ لہٰذا دیدارِ حق اور کمالِ زندگی ایک ہی مقام کے دو نام ہیں۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ ایمان والو خدا اور رسول کی پکار کو سنو جب وہ تم کو اس چیز کی طرف بلائے جو تمہیں زندہ کرنے والی ہے (يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ)۔

اقبال قرآن اور حدیث کے ان مضامین کو ایک شعر میں جمع کرتا ہے:

کمالِ زندگی دیدارِ ذات است

طریقش رستن از بندِ جہات است

ایسے زندہ دل باکمال عاشقِ صادق کو ہی خطاب کر کے اقبال کہتا ہے :

لحد میں بھی یہی غیب و حضور رہتا ہے !

اگر ہو زندہ تو دل ناصبور رہتا ہے !

مہ و ستارہ مثالِ شرارہ یک دو نفس

مئے خودی کا ابد تک سرور رہتا ہے !

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا

ترے وجود کے مرکز سے دُور رہتا ہے !

زندہ رہنے کی شرط

زندہ رہنے کی شرط یہ ہے کہ انسان خودی کے اس کمال تک پہنچے جہاں وہ زمان و مکان (جن سے یہ جہان بنا ہے) کی حدود کو عبور کر جائے اور اس طرح سے خود زمان و مکان سے آزاد ہو کر زمان و مکان (جہان) کو خودی کے دام میں لے آتے۔ اس کے برعکس اگر انسان کی خودی زمان و مکان کے دائرہ میں مقید رہے گی تو وہ موت کے بعد زندہ نہیں رہ سکے گا۔ حیات یہی تو ہے کہ جہان کو خودی کا قیدی بنایا جائے۔ جو شخص خود جہان کا قیدی ہے وہ جہان کو اپنا قیدی کیسے بنا سکتا ہے۔

حیات چیست؟ جہاں را اسیر جاں کردن

تو خود اسیرِ جہانی کجا توانی کرد !

خدا سے دُور ہونا موت ہے۔ جو انسان زندہ ہو وہ خدا سے دُور نہیں ہوتا اور جو دُور ہوتا ہو وہ زندہ نہیں ہوتا۔

بے حضوری ہے تیری موت کا راز

زندہ ہو تُو تو بے حضور نہیں !

ابدیت کی ابتدائی شرط عشق ہے اگر اس کے کچھ اور اصول اور لوازمات بھی ہیں تو وہ سب عشق کے ماتحت ہیں۔ جب تک کہ عقل مادی عناصر کی ترتیب کا نتیجہ ہے اور مادی دنیا کے اندر

© rasailojaraid

تصرف کرنے کے لیے کام میں آتی ہے، وہ جسم کی موت سے فنا ہو جاتی ہے لیکن عشق کسی حالت میں فنا نہیں ہوتا۔ اگر موت ایک شام ہے تو عشق ایک سورج ہے۔ سورج کے سامنے شام کہاں رہ جاتی ہے عشق خود زندگی کا ہی سوز ہے۔ جہاں یہ سوز ہوگا وہاں زندگی ضرور ہوگی اور جہاں زندگی ہوگی وہاں موت کیسے ہو سکتی ہے۔ عشق کا مرنا زندگی کا مرنا ہے، جو محال ہے:

ہے ابد کے نسخۂ دیرینہ کی تمہید عشق — عقلِ انسانی ہے فانی، زندۂ جاوید عشق
عشق کے خورشید سے شامِ اجل شرمندہ ہے — عشق سوزِ زندگی ہے تا ابد پائندہ ہے

انسان کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ اس کی خودی کمال تک پہنچے۔ اگر زندگی کا صدف خودی کے قطرۂ نیساں کو گہر بنا کر حالتِ کمال تک نہیں پہنچا سکتا تو بے سود ہے۔ خودی کے کمال کے معنی یہ ہیں کہ خودی خودنگر ہو جائے، یعنی خدا کا دیدار پا کر اپنے آپ کو دیکھ لے، خودگر ہو جائے یعنی خدا کے عشق سے اپنی تعمیر اور تربیت کو مکمل کر لے، اور خودگیر ہو جائے۔ یعنی اپنے آپ کو غیر اللہ سے ہٹا کر پوری طرح سے اپنی گرفت میں یعنی اپنے اصلی محبوب کی محبت کی گرفت میں دے دے۔ جب یہ صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے تو پھر خودی جسم کی موت سے بھی مر نہیں سکتی۔

زندگانی ہے صدف، قطرۂ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خودنگر و خودگر و خودگیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے!

عاشق کامل کو یقین ہو جاتا ہے کہ وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے یقین ہوتا ہے کہ وہ زندگی یعنی خدا کے عشق سے بہرہ ور ہے۔ حالتِ عشق سے پہلے انسان کو شک رہتا ہے کہ وہ بعد از مرگ زندہ رہے گا یا نہیں۔

در بود و نبودِ من اندیشہ گماں ہا داشت — از عشق ہویدا شد ایں نکتہ کہ ہستم من

حیات بعد الممات کا ثبوت

om

پھر بھی موت نہیں ہوتی۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ اسے موت ہر طرف سے گھیرتی ہے۔ پھر بھی وہ مرکر عذاب سے نجات نہیں پاتا۔ (وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ)۔ اقبال اسی زندگی کو ہی موت کہتا ہے' ورنہ موت نما زندگی تو بعد از مرگ کافر کو بھی ملتی ہے۔ اور اسی موت نما زندگی کی وجہ سے اس کا بعد از مرگ عذاب دوزخ ممکن ہوتا ہے۔ شعور جب خود شعور یا خود شناس ہو جائے جیسا کہ انسان کا شعور ہوتا ہے' دوسرے لفظوں میں جب شعور انسانی سطح پر آجائے' تو وہ خواہ کافر کا شعور ہو' حیوان کے غیر خود شعور غیر خود شناس شعور کی طرح موت کے معمولی معنوں میں مر نہیں سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جسم کی زندگی میں بھی ایسے خود شناس شعور کے وجود کا انحصار جسم پر نہیں ہوتا، بلکہ اس کی زندگی جسم سے الگ تھلگ اور بے نیاز ہوتی ہے۔ اسی خود شعور یا خود شناس شعور کو ہم انسانی شخصیت یا خودی یا روح کا نام دیتے ہیں اور یہ صرف انسان کا خاصہ ہے۔ حیوان خود شناسی یا خود شعوری کے وصف سے محروم ہے' کیونکہ حیوان فقط جانتا، محسوس کرتا اور سوچتا ہے لیکن انسان جب جانتا، محسوس کرتا اور سوچتا ہے تو وہ جانتا بھی ہے کہ وہ جانتا، محسوس کرتا اور سوچتا ہے۔ اسی حقیقت کو ہم مختصر الفاظ میں یوں ظاہر کرتے ہیں کہ حیوان فقط باشعور ہے' اور انسان خود شعور بھی ہے۔ اسی خود شعوری کی وجہ سے انسان اپنے وجود کا، اپنی انا کا، اس کی وحدت کا اور اس کے تسلسل کا احساس کرتا ہے۔ اگر ایک انسان زید سو سال تک بھی زندہ رہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ وہی زید ہے جو چار سال کی عمر میں تھا۔ اس کے حافظہ میں اس کی زندگی کے تمام چھوٹے بڑے واقعات جن سے پورا ایک دفتر بن سکتا ہے' محفوظ ہوتے ہیں۔ اگر وہ کچھ واقعات کو بھول بھی جاتے تو پھر بھی وہ اس کے لاشعور میں محفوظ رہتے ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ایک تحلیلِ ذہنی کا ماہر اس پر ہپناٹک نیند طاری کر کے ان کی پوری تفصیلات اس کے منہ سے کہلوا سکتا ہے اور بیداری کے وقت اس سے اقرار کروا سکتا ہے کہ وہ فی الواقع ظہور پذیر ہوئے تھے۔

اعمال کا نہ مٹنے والا ریکارڈ

آج ماہرینِ تحلیلِ نفسی کے تجربات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ انسان کا کوئی چھوٹا یا بڑا عمل ایسا نہیں ہوتا جو ضائع ہو جاتا ہے۔ بلکہ ہر عمل کا ریکارڈ اس کے لاشعور کے اندر ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ واقعات کا یہ حیرت انگیز نہ مٹنے والا ریکارڈ انسان ...

©rasailojaraid

نہیں۔ اس کا جسم سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اس کا تعلق انسان کی خود شعوری یا خودی سے ہے' جو جسم سے الگ تھلگ اپنی زندگی بسر کرتی ہے' اگرچہ جسم پر حکمرانی کرتی ہے اور اپنے مقاصد کے لیے اسے بطور ایک آلہ کے استعمال کرتی ہے۔ اگر اس کا تعلق جسم سے ہوتا تو ہر تین سال کے بعد یہ فنا ہو جاتا اور انسان کی زندگی کا تسلسل ٹوٹ جاتا' کیونکہ یہ امر مسلم ہے کہ کم و بیش ہر تین سال کے بعد دماغ کے تمام مادی ذرات مٹ کر نئے مادی ذرات کے لیے جگہ خالی کر دیتے ہیں۔ چار سال کی عمر سے لے کر سو سال کی عمر تک یہ عمل بتیس دفعہ ہو چکتا ہے۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ شخصیت یا خودی یا خود شعوری جسم سے بے نیاز ہو کر اپنے وظائف ادا کرتی اور اپنی زندگی قائم رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خودی جسم کی موت سے نہیں مرتی۔ دماغ اور جسم خودی کے آلات ہیں جن کی مدد سے وہ اس دنیا میں اپنا کام کرتی ہے اور اپنے اعمال' افعال اور اپنے تجربات کو ترتیب دیتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اگر دماغ کو کوئی نقصان پہنچ جاتے تو خودی اپنے وظائف ٹھیک طرح سے یا پوری طرح سے ادا نہیں کر سکتی' لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ خودی اور دماغ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں یا ایک دوسرے کے متوازی ہیں۔ کیونکہ جیسا کہ نفسیاتِ دیوانگی کی تازہ تحقیقات سے ظاہر ہے' دماغ کے مختل ہونے کے بعد بھی شخصیت لاشعور میں موجود رہتی ہے۔ اس کا مطلب فقط یہ ہے کہ خودی کا آلہ شکستہ ہو جانے کی وجہ سے خودی کو شعور کی دنیا میں کام نہیں دے رہا' لیکن جب دماغ اور جسم خودی کے آلات کے طور پر صحت مند ہوں تو ان آلات کی مدد سے ہر تجربہ جو خودی کو حاصل ہوتا ہے اور ہر فعل جو اس سے سرزد ہوتا ہے' دماغ اور جسم کی وساطت کے بغیر خودی کا جزو بن جاتا ہے اور پھر ہمیشہ بنا رہتا ہے۔ اور جسم کے مر جانے سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ جسم کی زندگی میں بھی یہ تجربہ یا فعل جسم کا نہیں بلکہ خودی کا حصہ تھا اور خودی جسم کی زندگی میں اگرچہ جسم کو کام میں لاتی تھی تاہم جسم سے بے نیاز ہو کر اپنی زندگی کو قائم کیے ہوئے تھی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں ہے کہ انسان کے اعمال لکھے جاتے ہیں اور موت کے بعد اس کا اعمالنامہ اس کے سامنے کھل جاتا ہے (كِتَابًا يَلْقٰهُ مَنْشُوْرًا) اس سے ظاہر ہے کہ شخصیت وہی کچھ ہوتی ہے جو اس کے اعمال اس کو بنا دیتے ہیں اور جسم کی موت کے بعد اس کی خوشی یا ناخوشی، صحت یا بیماری، قوت یا کمزوری اور اس کی زندگی کے کمال یا نقص کا دار و مدار اس بات پر ہوتا ہے کہ اس کے اعمال کہاں تک خودی کی

فطرت کے مطابق تھے ۔یعنی ان میں خدا کی مخلصانہ محبت کا حصہ کیا تھا۔جب خدا کی محبت کمال پر ہو تو خودی کی خود شناسی اور لہٰذا زندگی بھی کمال پر ہوتی ہے' کیونکہ خودی کی خود شناسی یہ ہے کہ وہ اپنے محبوب کو اپنی فطری استعداد کے مطابق پوری طرح سے جان لے۔اسی لیے اقبال کہتا ہے ،

ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تُو موت سے بھی مر نہ سکے!

انسان اور حیوان کی زندگی

بعض وقت یہ سوال کیا جاتا ہے کہ آیا حیوانات بھی مرنے کے بعد زندہ رہیں گے اور ان کے اعمال کا بھی محاسبہ ہوگا۔یہ سوال درحقیقت زندگی اور محاسبۂ اعمال کے متعلق ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔بعد از مرگ زندگی فقط خود شعوری کے لیے ممکن ہے' کیونکہ یہی خود شعوری ہے جو جسم کی زندگی میں بھی جسم سے الگ رہ کر اپنی زندگی بسر کرتی ہے۔اور یہی خود شعوری ہے جو آزاد اور با اختیار فیصلوں کی قوت رکھتی ہے یا جس میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ ان فیصلوں سے ظہور پذیر ہونے والے اعمال کو لاشعور کا جزو بنا کر یہاں تک محفوظ رکھے کہ وہ بعد از مرگ بھی اسی حالت میں رہیں حیوانات چونکہ خود شعور نہیں' وہ اپنے فیصلوں اور کاموں میں آزاد نہیں' بلکہ اپنی جبلتوں کے شکنجہ میں جکڑے ہوئے ہیں اور چونکہ وہ خود شعور نہیں' ان کے بعد از مرگ زندہ رہنے اور اپنے اعمال کو محفوظ رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔اور محاسبۂ اعمال تو بعد کی چیز ہے۔

★

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے اشاعت کی جاتی ہیں ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

© rasailojaraid